
سرِ شاخ
محمد بشیر رانجھا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سرِ شاخ

محمد بشیر رانجھا

سرِ شاخ

محمد بشیر رانجھا

اہتمام
کرنل (ر) سید مقبول حسین (ستارۂ امتیاز)

ISPR No.21-22-2001-PR(RA)4-1-2001

کتاب : سرِ شاخ
شاعر : محمد بشیر رانجھا
سرورق : سبحانی
کیلیگرافی : فرینڈز کمپیوٹر سنٹر، ۳۔ یوسف مارکیٹ
کمال آباد ۳، راولپنڈی فون: 5527241
اشاعت : مارچ ۲۰۰۱ء
قیمت : 100 روپے
رابطہ : مکتبہ رانجھا چک نمبر ۶۷ جنوبی، تحصیل بھلوال، ضلع سرگودھا

اظہارِ تشکر

امان اللہ امان
ابنِ عاصم
افضل گوہر راؤ
ارشد معراج
روش ندیم
رانا سعید دوشی
راجہ محمد ثقلین
منیر ضیاء
امجد میر
مسعود ہاشمی
میر عباس تجلی
امجد جاوید
ممتاز امیر
ملک عرفان فانی
نوشاد قاصر

ناشر
حرف اکادمی
جی/۳۰۴، آمنہ پلازہ، پشاور روڈ، راولپنڈی فون (5478882)

انتساب

مولا رکھے خیال
دو ہی پھول ہیں میرے
رَملہ اور بلال

++++

فہرست

جانے کس بات پہ آیا ہے بہاروں کو حجاب
سبز موسم میں تو کھلتے ہیں سرِ شاخ گلاب

پہلا باب

شاعری میرے نزدیک ایک ایسا تخلیقی عمل ہے جس کے جراثیم انسان کے اندر اگر نہ ہوں تو وہ قوت از خود دم توڑ جاتی ہے جس سے یہ عمل وقوع پذیر ہو سکتا ہے۔ الفاظ اپنے آپ میں اک جہانِ معنی رکھتے ہیں، یہ اس گیلی مٹی کی طرح ہوتے ہیں جس سے آپ جو چاہیں بنا سکتے ہیں اور یہ اتنے ملائم اور نازک ہوتے ہیں کہ اگر ان کا استعمال ٹھیک طرح سے نہ کیا جائے تو یہ چکنی مٹی کی طرح کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں اور لکھنے والے کی گرفت سے آزاد ہو کر اس کے چہرے کو برص کی طرح داغدار کر جاتے ہیں۔ میں نے لفظوں سے، شعر کے پیرائے میں، اپنی داخلی اور خارجی کیفیات کا پہلی بار اظہار کیا ہے۔ میرا تخلیقی سفر، بالخصوص شاعری کے حوالے سے، اتنا پرانا نہیں۔ ہزاروں لوگ مجھ سے بہتر اور اچھا شعر کہہ رہے ہیں۔ شاعری مطالعے کی حد تک ضرور میری پسندیدہ صنف ہے۔ لیکن میں نے حرف کی حرمت اور استعمال کو ہمیشہ مدِنظر رکھا ہے۔ جو میرا مقصودِ حیات ہے۔ کیونکہ اگر شاعری میں مقصدیت نہ ہو تو وہ بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایک اور بات کہ میں رانجھا ہونے کے باوجود ہیر کے ہجر و فراق کا رونا دھونا یا گل و بلبل کی داستان لے کر آپ کے پاس نہیں آیا۔ لیکن رومانیت اور دل کا گداز ایک عام انسان جتنا مجھ میں بھی ضرور ہے۔ البتہ میں گھسے پٹے موضوعات پر لکھنے یا کہنے کو کارزیاں سمجھتا ہوں۔ عشق و عاشقی کے جھمیلوں میں بھی نہیں پڑتا، کیونکہ اس وقت بات کہنے اور سننے کے تقاضے ہی بدل گئے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ موجودہ عہد میں محض عشق و عاشقی کی داستانیں کہنا کسی بھی شاعر کا مسئلہ نہیں ...... بلکہ بین الاقوامی منظرنامے کو دیکھیں تو ہمارے ماحول اور معاشرے کے مسائل جو بن رہے ہیں وہ یہ ہیں کہ ہم معاشرتی اقدار، اسلامی ثقافت، روایات اور سب سے بڑھ کر مذہبی ورثہ سے نابلد ہوتے جارہے ہیں۔ ترقی کی روشن روشن بلندیوں کے دھوکے میں ہم تیرگی کی اتھاہ گہرائیوں کی جانب بڑے فخر اور وقار کے ساتھ بے محابا بڑھے جارہے ہیں جو ہمارے اور ہماری نئی نسل کے لئے سمِ قاتل ہے۔ اس نام نہاد ترقی کا زہر ہماری نوجوان نسل کی رگوں میں کینسر کی طرح خاموشی، مگر بڑی سرعت، سے پھیلتا جارہا ہے لہٰذا ہمیں نئے بین الاقوامی تناظر میں بات کہنی ہے اور اسے اپنے ماحول، روایات و اقدار اور مذہب، ملت اور مسلم ثقافت کے سانچوں میں رکھ کر نئی نسل کو پیش کرنی ہے۔

میں اپنے آپ کو ایک دیہاتی بلکہ مضافاتی شاعر یا ادیب کے طور پر متعارف کرانے میں فخر محسوس کرتا ہوں۔ مجھے قطعی شرمندگی نہیں کہ میں دیہات کی کھلی فضاؤں میں پروان چڑھا ہوں اور میں اردو تو کیا فارسی، انگریزی، پشتو یا عربی زبان بھی سرگودھا کی مضافاتی یا علاقائی زبان میں ہی بولتا ہوں۔ پیشہ ورانہ طور پر بھی دیکھیں تو میں آرمی میڈیکل کور میں بہت ہی نچلے درجے کا ایک سپاہی ہوں، لیکن مجھے اپنی یونیفارم، شعبہ اور پیشے پر ہمیشہ فخر رہا ہے۔ اس افتخار کو ہی میں اپنے لئے اعزاز سمجھتا ہوں۔

میں زودگوئی کا بھی قائل نہیں۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ شعر کبھی کبھی ہوتا ہے اور شاعری پارٹ ٹائم جاب ہی مناسب رہتی ہے۔ اگر اسے پیشہ بنالیا جائے تو شاعری تخلیق نہیں بلکہ پیداوار کا درجہ حاصل کرلیتی ہے اور پیداوار میں نقائص ہونے کا احتمال ضرور رہتا ہے جبکہ تخلیق کے پیچھے بندے کی ریاضت اور مشاہدہ ہوتا ہے یوں شاعری اور تخلیق میں واضح فرق یہ ہوا کہ شاعری عام لوگوں کا کام ہے اور تخلیق خواص سے منسلک اور منسوب ہے۔ میرا کام آپ کے سامنے ہے یہ کس معیار یا مرتبے کا مستحق ہے میں نہیں جانتا، لیکن میں نے اپنی داخلی اور خارجی

کیفیات کو آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے ۔ ویسے بھی یہ بات مشہور ہے کہ غزل میں ایک دو شعر اگر اچھے ہوں تو وہ غزل بن جاتی ہے اور اگر پوری کتاب میں ایک بھی غزل اچھی نکل آئے تو بندہ اپنے آپ کو شاعر کے طور پر متعارف کرانے کا استحقاق رکھتا ہے ۔ مجھے امید ہے کہ میرا یہ استحقاق مجروح نہیں ہو گا ۔

میں بنیادی طور پر نثر لکھتا ہوں ۔ تحقیق، تنقید، افسانہ، ترجمہ اور مزاح میرے موضوعات ہیں ۔ اور میں over projection کے بھی سخت خلاف ہوں ۔ بس خاموشی سے جو بہتر سمجھتا ہوں وہ کام کئے جا رہا ہوں، مجھے واویلا نمود کی خواہش ہرگز نہیں، بس شعر و ادب میں اپنے حصے کا کام کرنا چاہتا ہوں ۔ میں نے شعوری کوشش کی ہے کہ میں قدرے کھردری باتیں کسی نئے زاویے سے شعر کے پیرائے میں کہوں ۔ میری یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہے میں اس کا فیصلہ بھی ہرگز نہیں کر سکتا ۔ اچھا شعر کہنا میرا فرض تھا لیکن معیار کا پیمانہ میرے ہاتھ نہیں آپ کے پاس ہے، مجھے اپنے سب شعر اچھے لگے ہیں اور میں نے ان میں زیادہ کانٹ چھانٹ بھی نہیں کی ۔ کیونکہ شعر اولاد کی طرح ہوتے ہیں اور اولاد جیسی بھی ہو والدین کو پیاری ہوتی ہے ......

میں تو ایک ایسا پاپی فنکار ہوں جو شاعروں یا تخلیق کاروں کی محفلوں میں صرف شرکت کرنے کو ہی اپنے فن کی معراج سمجھتا ہے ۔ لہٰذا اس کتاب کو میرا "پہلا پاپ" سمجھ کر میرے فن کی پیمائش کی جائے ۔ اور "نام نہاد ٹھیکیدار حضرات" سے بھی گزارش ہے کہ مجھے سزا ضرور دیں، تنقید کا حق آپ کو حاصل ہے لیکن یاد رہے کہ تنقیص اخلاقیات کے زمرے میں ہرگز نہیں آتی ......

میرا یہ بھی ایمان ہے کہ مثبت تنقیدی رویوں سے ہی تخلیقی عمل نمو پذیر ہوتا ہے نیز فنی پختگی تک پہنچنے کے لئے انہی رویوں سے ہی رہنمائی مل سکتی ہے ۔ لہٰذا مثبت اور تعمیری تنقید کو میں بھی کھلے دل سے قبول کروں گا ۔ ویسے بھی میرا فنی اور تخلیقی سفر ابھی اپنے نقطۂ آغاز پر ہے اس لئے گزارش یہ ہے کہ مجھے شہر بدر بھی مت کریں کیونکہ شہر بدری کی سزا انسان کو اذیت پسند بنا دیتی ہے اور یوں وہ تخلیق

کے آسن پر بیٹھ کر اپنے لہو کے چراغ جلانے پر مجبور ہو جاتا ہے یا پھر تنہائی کے گمنام صحرا میں بھٹک جاتا ہے جبکہ میں اب کسی صورت بھی پھر سے تنہائی پسندی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

آخری گزارش یہ ہے کہ آدھے پتھر میرے انتہائی محترم جناب شاکر کنڈان، جناب کرنل مقبول حسین صاحب کے نام بھی ضرور کریں کہ جن کی بھرپور رواو بلکہ شہہ پر میں یہ پاپ کر رہا ہوں اور اگر اس کتاب میں کوئی اچھا شعر ہے تو میں اسے انہی کرم فرماؤں کے نام معنون کرتا ہوں۔

محمد بشیر رانجھا

رانجھا سب کا سانجھا

رانجھا عشق، جہدِ مسلسل اور سادگی کا سمبل ہے۔ لاڈ اور پیار میں پرورش پانے والا خدا بخش ...... پہلے وحید وا اور پھر رانجھا کیسے بنا؟ کہنے کو تو یہ ایک ذات، قوم یا قبیلہ کا لاحقہ ہے جواب سابقہ ہی نہیں بلکہ نام کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ لیکن جب خدا بخش سے وحید وا اور وحید وے سے رانجھا تک کے سفر پر غور کیا جائے تو ایک طویل داستان اور بہت لمبا "پینڈا" دکھائی دیتا ہے۔ اس عشق، جہدِ مسلسل اور سادگی کے سمبل کو "دمودر" سے "وارث شاہ" اور "وارث شاہ" سے لے کر "رانا سعید دوشی" تک بے شمار شعراء اور نثر نگار اپنے الفاظ میں لے کر اٹھے اور بڑھے۔ اور یوں اس حوالے سے یہ سمبل (رانجھا) کسی ایک تک محدود نہ رہا بلکہ ہر دور نے اسے اپنا سمجھا اور یوں یہ سب کا "سانجھا" بن گیا۔ اسی قبیلے کا ایک شخص "سر شاخ" بیٹھا آج سوچ رہا ہے کہ وہ کیسے اپنے بزرگوں کے دیئے نام کی حفاظت کر سکتا ہے۔ اور میں دیکھ رہا ہوں کہ زیرِ تذکرہ رانجھا بھی اپنے پُرکھوں کی طرح محبت، خلوص، اپنی تحریروں اور اشعار کے حوالے سے پھیل کر اس دور میں "سب کا سانجھا" ہو گیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ شاعری کا تعلق روحوں سے ہوتا ہے اور شعر میں جو بات ہوتی ہے وہ دلوں پر براہِ راست اثر کرتی ہے۔ یوں شعر کو ہر خاص و عام پسند کرتا ہے خواہ وہ بتکدے میں ہو، میکدے میں ہو یا مسجد کے منبر پر ہو۔ اپنی بات میں اثر پیدا کرنے کے لئے شعر کا سہارا ضرور لیتا ہے۔

''سرِ شاخ'' کا رانجھا جو اصل میں محمد بشیر ہے لیکن کبھی ''ابو بلال'' کے نام سے اور کبھی ''محمد بشیر رانجھا'' کے نام سے سامنے آتا ہے۔دیکھنے کو تو ایک چھوٹا سا عہدیدار ہے جو سارا دن دفتر کو فائلوں میں گم کام میں مگن رہتا ہے۔لیکن اس دفتری کام میں بھی وہ ہر متعلقہ شخص کو کوئی نہ کوئی فائدہ پہنچا رہا ہوتا ہے۔دفتری اوقات سے ہٹ کر یہ شخص عشق،جہدِ مسلسل اور سادگی کا وہی سمبل ہے۔کبھی علم کے حصول کے لئے کوشاں، کبھی خلوص اور محبت سے پیش آنے میں مگن، کبھی دوستوں کے کام میں مصروف اور کبھی پڑھنے لکھنے میں محو......اردو، فارسی، عربی، انگریزی، پشتو، پنجابی اور سندھی زبانوں کے لٹریچر کا رسیا......اقبال کے کلام کی روح کو سمجھنے میں ہر وقت رواں......امامِ اعظم ابو حنیفہؒ کے فقہ کو جاننے میں لحہ لحہ سرگرداں......سعدی کی گلستان و بوستان کو پرکھنے......اقبال، شاہ لطیف، رومی، حافظ شیرازی، برگساں، گوئٹے، خواجہ فرید، رحمٰن بابا اور شیکسپیئر کی فکری مماثلتیں تلاش کرنے میں کوشاں......تصوف، شخصیات، کالم اور ادب میں صفحات کے صفحات لکھ کر ڈھیر لگانے والا......کمپیوٹر کی طرف آیا تو کمپیوٹر سائنس میں مہارت حاصل کی......اور جب شاعری کی طرف توجہ دی تو ''پہلا پاپ'' کر بیٹھا اور پاپ بھی ایسا کہ جس کے منہ کو لگ جائے تو اس کا عادی ہو جاتا ہے اور یہ عادت پھر بقول شخصے

ع چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

اور مجھے ڈر ہے کہ یہ پاپ محمد بشیر رانجھا کی متعدد دیگر صلاحیتوں کو کہیں لے ہی نہ ڈوبے۔لیکن اس کے باوجود میں اس لئے مطمئن ہوں کہ میں نے اس شخص کو بہت باحوصلہ پایا ہے جو پاپ کرنے کے بعد گھبرایا نہیں، شرمندہ نہیں ہوا بلکہ اپنے اسی جرم کا برملا اعتراف کر کے قارئین کی عدالت میں اپنے آپ کو پیش کر دیا ہے کہ اس کی سزا تجویز کی جائے بلکہ دی جائے۔

میں نے کتاب کو پڑھا تو اسے متنوع مضامین کا مجموعہ پایا۔اس میں بھرپور تاثر یہ ملا کہ محمد بشیر رانجھا اپنی روایات، اپنی اقدار اور بزرگوں کے اصولوں

کے ساتھ ساتھ اپنی آبائی سرزمین، اس خطے سے جنم لینے والی عادات وخصائل، محبت ونفرت کی شدت، روزمرہ کی مصروفیات اور رسومات کے ساتھ ساتھ زندگی کے حقائق کو نہیں بھولا......بشیر رانجھے کا تعلق گاؤں سے ہے اور گاؤں کی زندگی شہر سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ وہاں آدمی فطرت کا بالکل نزدیک سے مشاہدہ کر سکتا ہے۔ سرسبز وشاداب کھیت......درختوں پہ چہچہاتے پرندے......مٹی کی خوشبو، پھلوں اور پھولوں کی مہک......یہ سب انسان کے اندر تازگی ورعنائی پیدا کرتے ہیں......لہذا اسی پس منظر میں رانجھا نے اپنے تمام استعارے، اشارے اور کنائے استعمال کیے ہیں۔ انہی استعاروں سے اس نے آج کے دور کی بے قاعدگیوں اور جبر واستبداد کو لفظوں کی صورت میں سامنے لانے کی کوشش کی ہے

نجانے اب کے پرندوں کا کیا بنے گا یہاں
شکاریوں کے درختوں پہ بھی جو جال ہوئے

سب پرندے چھپے ہیں پیڑوں پر
کون ہے یہ شکار کے پیچھے

یہ بات شہر کی زندگی کی نہیں بلکہ اس میں دیہات کے اس ماحول کا رنگ ہے۔ جہاں صبح سویرے، دو تین بجے کے لگ بھگ ایک شکاری ہاتھ میں جال لے کر کھیتوں میں جاتا ہے۔ جال پھیلا کر اپنے سدھائے ہوئے تیتر یا بٹیر کو جال کے پیچھے رکھتا ہے۔ اس کے بولنے پر کھیت میں موجود تیتر یا بٹیر جال کی سمت آتے ہیں اور پھر جونہی وہاں پہنچ کر خطرے سے آگاہ ہوتے ہیں تو وہ اڑنے کی کوشش میں جال میں پھنس جاتے ہیں......یا گھنے درختوں میں چھپے ہوئے پرندوں کو ڈھونڈنا اور بندوق یا غلیل سے ان کا شکار کھیلنا......یہ ماحول اور کھلی فضا کی باتیں ہیں، یہ تجربہ شہر کے باسیوں کے مقدر میں نہیں۔ جن کے نزدیک سے بھی فطرت نہیں گزر پاتی......جن کی صبح ہی دس بجے ہوتی ہے اور جو مشینی دور کی مشینیں بن کر رہ گئے ہیں۔ جبکہ محمد بشیر رانجھا نے اپنی شاعری میں فطرت کی بات

کی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ فطرت زندگی کا نام ہے ۔ زندگی حرکت ہے، عمل ہے، احساس ہے، مشاہدہ ہے، محبت کی تڑپ ہے، نفرت کا جذبہ ہے، یگانگت ہے، انتقام ہے، وصال کی سرخوشی ہے، فراق کا کرب اور غم ویاس کی دلدوزی، ظرافت ہے، سوز وگداز ہے، خودداری و عالی حوصلگی ہے ۔ محمد بشیر رانجھا نے اسی زندگی اور فطرت کی بات کی ہے ۔ اس نے تشبیہات کی لطافت اور استعارات کی ندرت سے حسنِ بیان کو امتیازی خصوصیات کا حامل بنادیا ہے ۔ مضمون آفرینی اور جدتِ ادا سے فلسفۂ غم، فلسفۂ عشق اور فلسفۂ حیات کو ایک تاثیر اور رنگینی عطا کی ہے۔

اور ہاں! چونکہ محمد بشیر رانجھا کی تحریر میں بنیادی وصف اس کے صوفیانہ خیالات ہیں، لہٰذا اس نے اپنی شاعری میں بھی ان روایات کا خاص خیال رکھا ہے ۔ ترکیبوں اور بندشوں میں اپنے رجحان اور پاکیزہ خیالات کو بھی جگہ دی ہے ۔ حمد و نعت کے علاوہ تغزل کے رنگ میں بھی تصوف کو اس کی حقیقی جذباتیت اور مکمل استقلال اور ٹھہراؤ سے پیش کیا ہے:

نہ آئی کوئی کمی میری لغزشوں میں بشیر
نہ فرق اس کے ہی جاہ و جلال میں آیا

میں بانٹتا ہوں محبت بساط سے بڑھ کر
تو میرا مولا بھی رکھتا ہے مالا مال مجھے

شاید زمین چھوڑنی پڑ جائے ایک دن
کوئی بلا رہا ہے مجھے آسمان سے

محمد بشیر رانجھا ایسا ہی ایک حقیقت پسند انسان ہے جسے کبھی بھی مصلحت کے پیچھے بھاگنا اچھا نہیں لگا۔ بلکہ اگر یہ کہوں کہ وہ سیدھا سادا دیہاتی

ہے جس میں خود غرضی، رعونت اور ہوس کاری کا شائبہ تک نہیں، تو بے جا نہ ہو گا۔ محبتیں بانٹنا اس کے لئے روحانی سکون کا باعث ہے۔ دیہات کی سادہ غذا اور صاف ہوا کی طرح وہ بے لوث، مخلص اور صاحب کردار ہے۔ جو اپنے خالص پن کے ساتھ ساتھ وسیع النظر اور بلیغ اندازِ فکر کا مالک ہے۔ وہ احساسات و جذبات کے اظہار کا فن بخوبی جانتا ہے اور فکر و شعور کے قمقمے روشن کر کے راہرو کو تاریکی میں اُجالا مہیا کرتا ہے۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ رانجھا کے ہر شعر کی تشریح اس کی اندرونی کیفیات اور بیرونی محسوسات کے حوالے سے کروں لیکن...... بہر حال رانجھا کے ان اشعار کے ساتھ ہی اجازت چاہوں گا

تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی کو خبر کیا
گرداب کبھی آب کو کائی نہیں دیتا

میں خوشبو بانٹنے نکلا جو بستی میں تو میں نے
بس اک پتھر کے گھر میں کانچ کا گلدان دیکھا

قسمت میں تھا جو آ کے پڑے ہیں نشیب میں
بچے وگرنہ ہم کسی اونچے شجر کے ہیں

سحر کے وقت تو نکلا تھا آب و تاب کے ساتھ
ہوئی ہے شام تو سورج زوال میں آیا

پروں میں آسماں بھر کر انہیں اڑنا سکھا رانجھا
پرندوں کو اسیر آب و دانہ کیوں بناتا ہے

شاکر کنڈان

(سرگودھا)

ساری دنیا میں نہیں اُس سا شہنشہ کوئی
میرا معبود ہے جیسا نہیں ویسا کوئی

پیاس سے خشک ہوئی مولا مرے دِل کی زمیں
کاش اِک ابر اِدھر آ کے برستا کوئی

ہم نے یہ دُھوپ میں دیکھا ہے سفر کرتے ہوئے
اُس کا سایہ ہے کہ جس کا نہیں سایہ کوئی

میں تو دھرتی پہ فقط خاک کا اِک ذرّہ ہوں
اُس سا دُنیا میں بڑا میں نے نہ دیکھا کوئی

یوں اکیلا ہوں کہ دنیا میں کہیں تیرے سوا
مجھ کو ملتا نہیں کہدوں کہ ہے میرا کوئی

اُس کی یادوں میں کبھی سر کو جھکایا تو بشیرؔ
کاندھے پہ بیٹھ گیا آ کے پرندہ کوئی

ازل سے حوضِ کوثر کا امیں ہے
مرے محبوبؐ سا کوئی نہیں ہے

زیارت آپؐ کی ہو جائے آقاؐ
بڑا بے چین یہ قلبِ حزیں ہے

جہاں میں ہیں ہزاروں حسن والے
کہاں پر آپؐ سا کوئی حسیں ہے

بچھی ہے آپؐ کی اس جا چٹائی
جہاں سے دو قدم عرشِ بریں ہے

مرے آقاؐ کوئی جنت کا ٹکڑا
یقیناً تیرے کوچے کی زمیں ہے

جمالِ صُبح کا منظر دِکھانا ہی پڑے گا
بُجھا کر چاند سُورج کو جلانا ہی پڑے گا

دوبارہ آزمانے کا میں قائل تو نہیں ہوں
وہ کہتا ہے تو اُس کو آزمانا ہی پڑے گا

خبر اُس کی کہیں سے کوئی بھی آئی نہیں ہے
کبوتر پھر کوئی ہم کو اُڑانا ہی پڑے گا

یونہی خانہ بدوشی میں بہت دن رہ لئے ہیں
ہمیں اب اپنا کوئی گھر بنانا ہی پڑے گا

پُرانے لفظ کہنے سے کہانی ٹوٹتی ہے
نیا قصہ کوئی رانجھا سُنانا ہی پڑے گا

تم مت گھبراؤ
اِک دن بھر ہی جائے گا
تازہ ہے گھاؤ

گرچہ تلاشِ رزق میں رہتے بکھر کے ہیں
لیکن ہمیں تمام کسی ایک گھر کے ہیں

ایسا طلسمِ شب ہے کوئی دیکھتا نہیں
ذہنوں پہ کتنے نقش اندھیروں سے ڈر کے ہیں

قسمت میں تھا جو آ کے پڑے ہیں نشیب میں
پتے وگرنہ ہم کسی اونچے شجر کے ہیں

آزاد ہو بھی جائیں تو کب اُڑ سکیں گے ہم
ہم طائرِ زمین تو بے بال و پر کے ہیں

شاید نہیں قیام کسی کے نصیب میں
اب تک سفر میں سارے مسافر سفر کے ہیں

رانجھا ہمارے پاؤں میں ہی آبلے نہیں
دستار کے تلے بھی کئی زخم سر کے ہیں

اُس سے ملنا اگر ضروری ہے
دُھوپ میں اک سفر ضروری ہے

اِن پرندوں سے دوستی کے لئے
صحن میں اک شجر ضروری ہے

آرزو گر ہے چاہے جانے کی
دلبری کا ہنر ضروری ہے

سب کو ہی اپنے قد میں رہنا ہے
کیا یہ دستارِ سر ضروری ہے

پیڑ سے چھاؤں چاہنے والے
شاخ پہ بھی ثمر ضروری ہے

صرف خود کو ہی دیکھتے کیوں ہو
ہر طرف ہی نظر ضروری ہے

سوچنا زندگی نہیں ہے بشیرؔ
ہاتھ میں بھی ہنر ضروری ہے

بے منزل ہونے کا خوف بھی طاری رکھا
اپنے سفر کو لیکن ہم نے جاری رکھا

آندھی سے بھی ٹوٹنے کا اب ڈر رہتا ہے
شاخوں کو کچھ اتنا پھلوں سے بھاری رکھا

ہم تو محبت سب پہ نچھاور کرتے ہیں
لوحِ دل کو تم نے وفا سے عاری رکھا

وہ دُشمن تھا آخر اُس نے مار کے مجھ کو
میری لاش پہ بھی اک پتھر بھاری رکھا

بستی میں تاریکی ہی تاریکی تھی سو
دیا جلا کے ہم نے باری باری رکھا

رانجھاؔ دُشمن سر تک آ پہنچا ہے لیکن
ہم نے تیر کہاں ترکش میں کاری رکھا

جو نقش بھی مرے عکسِ جمال میں آیا
نہ خواب میں نہ کسی کے خیال میں آیا

سحر کے وقت تو نکلا تھا آب و تاب کے ساتھ
ہوئی ہے شام تو سورج زوال میں آیا

جو کیف ہم کو ملا ہے تری جدائی میں
وہ لطف ہم کو نہ تیرے وصال میں آیا

اثر ہو کوئی تو میری دعاؤں میں مولا
سوال کیا مرے دستِ سوال میں آیا

ہوا سسکنے لگی اور پیڑ رونے لگے
پرندہ جب بھی شکاری کے جال میں آیا

نہ آئی کوئی کمی میری لغزشوں میں بشیؔر
نہ فرق تیرے ہی جاہ و جلال میں آیا

میں راہ دیکھ رہا ہوں مگر نہیں آیا
تلاش تھی مجھے جس کی نظر نہیں آیا

سفر تمام کڑی دُھوپ میں ہی کاٹ لیا
کہیں بھی راہ میں کوئی شجر نہیں آیا

یہ آرزو تھی پرندہ بنوں، فضا میں اُڑوں
مگر بدن پہ مرے کوئی پَر نہیں آیا

میں تیری ذات کی پہچان کس طرح بنتا
مجھے شناخت کا اپنی ہنر نہیں آیا

نجانے کیسی پرندوں نے بد دُعا دی ہے
کسی شجر پہ بھی کوئی ثمر نہیں آیا

میں جل کے راکھ ہُوا ہوں ہجومِ یاراں میں
مجھے بچانے کوئی بھی بشر نہیں آیا

میں جس کے واسطے گھر سے نکل پڑا ہوں بشیرؔ
مجھے وہ لینے سرِ رہگذر نہیں آیا

کیا مِلنا تھا آنکھوں کے پایاب سمندر میں
گٹھڑی باندھ کے پھینک آیا ہوں خواب سمندر میں

وہ تو اپنی ذات میں کوئی بہتا دریا تھا
اتنی جلدی کیسے ہُوا غرقاب سمندر میں

ساحل ساحل ڈھونڈ رہے ہیں اب دیوانے لوگ
کچھ تو تھا جو ڈوب گیا نایاب سمندر میں

دل میں منزل تک جانے کا عزم ضروری ہے
رستے بن جاتے ہیں زیرِ آب سمندر میں

چاند سے پوچھتے پوچھتے رانجھا صدیاں بیت گئی ہیں
کب ٹھہراؤ آئے گا بے تاب سمندر میں

تو ہے بڑا انمول
جھیل سی گہری آنکھیں تیری
جھرنے جیسے بول

کوئی بھول ہوئی ہے شاید کہیں درختوں سے
چہرے ڈھانپ رہے ہیں پنچھی اب تو پتوں سے

تُو سورج ہے لیکن مجھ کو بھی نہ موم سمجھ
کتنے پتھر توڑ دیئے ہیں میں نے شیشوں سے

جانے کیا تھا یکدم ایسے نیند اچاٹ ہوئی
جیسے آنکھیں رکھ آئے ہیں باہر خوابوں سے

اپنی عمر سے جلد بڑا ہونے کا دُکھ ایسا ہے
بچپن ڈھونڈ رہا ہوں میں بچوں کے بستوں سے

دیر ہے رانجھا گھر سے باہر پاؤں رکھنے کی
منزل تک بھی ہو آئیں گے چل کر رستوں سے

پلا بڑھا ہوں میں آنگن کے اک شجر کے ساتھ
ہزاروں یادیں ہیں وابستہ میری گھر کے ساتھ

ہمارے عیب ہمارے ہنر میں ڈھل جاتے
ہمیں وہ دیکھتا گر پیار کی نظر کے ساتھ

میں بچ کے پھر بھی نکل آیا گہرے پانی سے
اگرچہ لڑنا پڑا ہے مجھے بھنور کے ساتھ

ہوئی ہے شام تو لوٹ آیا ہے تھکا ہارا
جو اپنے گھر سے نکل کر گیا سحر کے ساتھ

بشیرؔ! چاروں طرف کچھ نظر نہیں آتا
بدل گئے سبھی منظر تری نظر کے ساتھ

نہیں ہے اب یاد کیا بتائیں کہ کیا لکھی تھی
کبھی کوئی آنسوؤں سے ہم نے دُعا لکھی تھی

مری دلیلوں کے حق میں منصف نہیں تھا ورنہ
خطا تو اتنی نہیں تھی جتنی سزا لکھی تھی

جو رات آئی تو ہم نے ایسے دِیئے جلائے
نصیب میں جن کے ابتدا سے ہَوا لکھی تھی

مریض مجبور تھا اُسے بھی نگل گیا ہے
طبیب نے جس ورق پہ اُس کی دوا لکھی تھی

تُو آج خود ہی بدل گیا ہے تو یاد آیا
ترے لئے تو مدام ہم نے وفا لکھی تھی

شہر کو کیا غم ہے
دھوپ بچھی ہے سڑکوں پر
ہُو کا عالم ہے

لگے ہیں سوچ پہ پہرے تو یوں نڈھال ہوئے
تمام خواب محبت کے پائمال ہوئے

نکل ہی آئیں گے گھر سے مگر یہ ڈر بھی ہے
پھر اِس کے بعد اگر راستے محال ہوئے

تمام عمر رہے سانس سے بھی جو نزدیک
تمام عمر کہاں میرے ہم خیال ہوئے

نجانے اب کے پرندوں کا کیا بنے گا یہاں
شکاریوں کے درختوں پہ بھی جو جال ہوئے

ہماری کوششِ پیہم کے باوجود بشیر
تعلقات کہاں ٹوٹ کر بحال ہوئے

ضرورتیں ہیں بہت کم طلب زیادہ کرے
اب ایسی زیست سے بھی کون استفادہ کرے

مزا تو جب ہے کہ خود اپنی دھوپ میں سورج
مری طرح سے مسافت بھی پا پیادہ کرے

مرے بدن پہ لکھی ہیں ضرورتیں میری
اک اشتہار پہ اب کوئی کیا لبادہ کرے

شجر کے سارے پرندے فضا میں رہتے ہیں
زمیں پہ کوئی اترنے کا بھی ارادہ کرے

انا پرست طبیعت کو کب گوارہ ہے
زمیں کا پھول بدن کوئی سنگ زادہ کرے

دل میں کچھ اِضطراب رہنے دے
میری آنکھوں میں خواب رہنے دے

تُجھ کو کانٹوں سے پیار ہے لیکن
میرے گھر میں گلاب رہنے دے

میری آنکھوں نے پڑھنا سیکھا ہے
اپنا چہرہ کتاب رہنے دے

سلسلے قربتوں کے ٹوٹتے ہیں
فاصلوں کا حساب رہنے دے

شوقِ آوارگی نہ کر اتنا !
کچھ تو قائم حجاب رہنے دے

ریت پر ہے گمان پانی کا
آرزو کو سراب رہنے دے

کس قدر تاریک خوشبو کا مقدر ہو گیا
جب بہار آئی تو ہر اک پھول پتھر ہو گیا

کٹ گیا تیغِ ہوا سے، پر مرے حصے کا ابر
کچھ گرا صحرا میں جا کر، کچھ سمندر ہو گیا

ہم نے ملحوظِ نظر رکھے تھے آدابِ سفر
دشت بھی پاؤں تلے سبزے کی چادر ہو گیا

دیکھنا ہے اس حدودِ وقت سے آگے مجھے
یہ غبارِ راہ کیوں آنکھوں کی محور ہو گیا

اڑنے والی ساری چڑیاں پیڑ کا سنگھار تھیں
دیکھنا اب کیا شجر کتنا تناور ہو گیا

تُم سے بچھڑے تو یوں بے نشاں ہو گئے
ہم کو ایسے لگا بے اماں ہو گئے

اب تو خود سے بھی خود کو چھپاتے ہیں ہم
آنکھیں بے اشک ہیں دل دُھواں ہو گئے

قدو قامت میں تو سارے اک جیسے تھے
ہم زمیں، آپ کیوں آسماں ہو گئے

اور پھر ایک دن لوگ دربار میں
بولتے بولتے بے زباں ہو گئے

ہم کو تیرے سہارے پہ چلنا نہ تھا
چوٹ ایسی لگی ناتواں ہو گئے

بولنا جن کو آتا تھا وہ بھی بشیرؔ
آپ کے سامنے بے زباں ہو گئے

ایسے جنگل یہاں ویران ہوئے جاتے ہیں
سب پرندے ہی پریشان ہوئے جاتے ہیں

ہم تو پاؤں پہ بھی مشکل سے کھڑے ہیں ورنہ
وہ تھکاوٹ ہے کہ بے جان ہوئے جاتے ہیں

دیکھ یہ حال ہوا ہے کہ سرِ شام ہی اب
قافلے بے سروسامان ہوئے جاتے ہیں

ہم تو اندر ہی سے ٹوٹے ہیں مگر آپ کو کیا
آپ کیوں اتنے پریشان ہوئے جاتے ہیں

جانے اب کونسا ملبوس ملا ہے کہ بشیرؔ
لوگ سب چاک گریبان ہوئے جاتے ہیں

موسموں کے غبار کے پیچھے
دیکھ پت جھڑ بہار کے پیچھے

روشنی دائروں میں قید ہوئی
تیرگی کے خمار کے پیچھے

یوں ہی کھائی نہیں ہے میں نے شکست
جیت ہے کوئی ہار کے پیچھے

سب پرندے چھپے ہیں پیڑوں میں
کون ہے یہ شکار کے پیچھے

کوئی منظر نیا کھُلے رانجھا
کچھ تو ہو گا غبار کے پیچھے

برسوں کا ہنر رہ گیا ہاتھوں میں سمٹ کر
وہ سنک رہا سنک رگِ گُل سے بھی کٹ کر

کس گنبدِ بے دَر میں مُقیّد ہوں کہ ہر بار
ٹکرائی ہے مجھ سے مری آواز پلٹ کر

دراصل جسے اہلِ خِرد کہتے ہیں منزل
پھرتی ہے مرے پاؤں کی جنبش سے لپٹ کر

کیا ٹوٹتے ساحل پہ کھڑے سوچ رہے ہو
دریا کبھی بہتا نہیں کشتی میں سمٹ کر

تو رازقِ واحد ہے تو کیوں مجھ کو ہمیشہ
ملتا ہے مرا رزق کئی ہاتھوں میں بٹ کر

گزر گئے ہیں محبت میں کتنے سال مجھے
نہ لکھنا آیا کبھی اپنے دل کا حال مجھے

تری وفاؤں کی خوشبو چُھپاؤں گا کیسے
ہوا چلی ہے تو آیا ہے یہ خیال مجھے

میں بانٹتا ہوں محبت بساط سے بڑھ کر
تو میرا مولا بھی رکھتا ہے مالا مال مجھے

میں اپنے ہاتھ اِسی دُکھ سے کاٹ آیا ہوں
کبھی نہ آیا کسی حرف کا کمال مجھے

میں دے سکا نہ جسے راحتیں جہاں بھر کی
سمجھ کے چھوڑ گیا ہے وہ خستہ حال مجھے

زمیں سے تا بہ فلک دیکھتا ہوں میں تو بشیرؔ
ہر ایک جا نظر آیا ترا جمال مجھے

پیاسا ہے صحرا
کھل کے ابر نہیں برسا
آنکھ گئی پتھرا

کوئی رشتہ تو برقرار رہے
پھول دل کا سدا بہار رہے

آ ہی جاتا ہے دل کے گھر میں کوئی
آدمی جتنا ہوشیار رہے

ہو گئے نذرِ گردشِ دوراں
جو ہنر ہم پہ آشکار رہے

اے وطن !میں خزاں زدہ ہوں تو کیا
تجھ پہ تو سایہ ءِ بہار رہے

جسم تو ٹوٹنے سے بچ جائے
پیرہن چاہے تار تار رہے

نفرتیں مسئلوں کا حل تو نہیں
کچھ نہ کچھ درمیاں میں پیار رہے

یہ مسافر کی آرزو ہے بشیرؔ
دھوپ میں پیڑ سایہ دار رہے

میں کیسے اُس کا ہاتھ رکھوں اپنے ہاتھ میں
مطلب نکالتا ہو جو ہر ایک بات میں

ہر روز ہارتا ہوں اس سے دل کی بازیاں
اپنا ہی ایک لطف ہے اب ایسی مات میں

جب سے گری ہے شہر کے اطراف سے فصیل
دشمن بھی آ کے بیٹھ گیا میری گھات میں

پھر بَد دُعا سے سَبز شجَر سُوکھنے لگے
کتنا اُداس چاند ہے جنگل کی رات میں

اکثر بشیر پُوچھتا ہوں آئنے سے میں
مجھ سا ہے کون دوسرا اَب میری ذات میں

چائے کی پیالی پر
کوئی تو رونے والا ہو
میری بدحالی پر

آئے گی ایک روز اَجل کی نگاہ میں
کب تک رہے گی روح بدن کی پناہ میں

پھر یوں ہُوا کہ آمدِ فصلِ بہار سے
کانٹے گُلاب ہو گئے خوشبو کی چاہ میں

آئے ہیں گھر تو آئنے پہچانتے نہیں
چہروں پہ اتنی گرد پڑی اب کے راہ میں

آخر وہ اپنی عمر سے پہلے ہی مر گیا
ایسی ہوئی شکست بدن کو گناہ میں

منزل کی آرزو بھی نہیں ہے مگر بشیرؔ
پاؤں بھی ہم نے کھو دیئے ہیں اپنے راہ میں

کیا نقص دکھائی دے
میرے خواب کی دنیا میں
ترا عکس دکھائی دے

خبر نہیں ہے مجھے میں بھی کس جہاں میں ہوں
کسی مکان میں ہوں یا کہ لا مکاں میں ہوں

یہ کیا تو اپنے ہی حسن و جمال میں گم ہے
مجھے بھی دیکھ کہ میں زیبِ داستاں میں ہوں

اُسی میں اب تو مری وحشتوں کا ڈیرا ہے
تری گلی کے میں جس آخری مکاں میں ہوں

بنوں گا رزقِ زمیں ایک دن یونہی میں بھی
ستارہ بن کے ابھی تیرے آسماں میں ہوں

اتر کے بحرِ وفا پار کر گیا کوئی !
اور ایک میں کہ ابھی یوں ہی درمیاں میں ہوں

مری سرشت جنوں خیز ہے مگر رانجھا
یہی بہت ہے کہ پھر بھی تری اماں میں ہوں

ہاتھ لکیروں میں
کبھی دھڑکن رکھتی ہے
اسے آنکھ جزیروں میں

کہیں کیسے کہ جنگل میں سدا حیوان دیکھا
کہاں شہروں میں بھی ہم نے کوئی انسان دیکھا

یہ ہم کو کس سفر پر بھیج رکھا ہے کسی نے
ہمیشہ قافلے کو بے سر و سامان دیکھا

میں خوشبو بانٹنے نکلا جو بستی میں تو میں نے
بس اک پتھر کے گھر میں کانچ کا گلدان دیکھا

کہاں جاتا پہاڑوں سے اُتر کر بہتا پانی
نظر کے سامنے پھیلا ہوا میدان دیکھا

اگرچہ آنکھ خالی تھی مگر دل میں ہمارے
بشیؔر اک شخص تھا جس کو سدا مہمان دیکھا

دیا جلائے رکھنا
شاید لوٹ کے آجائے
آس لگائے رکھنا

پھر کیا ہے اگر لوگ نظر بند پڑے ہیں
آسیب زدہ شہر ہے گھر بند پڑے ہیں

وہ لوگ جو خود اپنی ہی نظروں سے ہیں اوجھل
ہم کیسے بتائیں کہ کدھر بند پڑے ہیں

منزل کے لئے چل کے کہاں جائیں مسافر
رستے بھی ہیں مسدود سفر بند پڑے ہیں

شاید ابھی پرواز کا موسم نہیں آیا
اُڑنے کی تمنا ہے تو پَر بند پڑے ہیں

میں شہر میں جنگل سے پریشان تھا رانجھا
دیکھا تو گھروں میں بھی کھنڈر بند پڑے ہیں

اس عمر کے حصے میں
ترا ذکر بھی ملتا ہے
اب درد کے قصے میں

سُورج سے کیا ہوئے ہیں ذرا بدگمان سے
اس بار دُھوپ ہم پہ گری سائبان سے

کتنی زمیں پہ تری مخلوق تنگ ہے
نیچے اُتر کے دیکھ کبھی آسمان سے

اب وہ کسی درخت کی شاخوں کا بوجھ ہیں
جن پنچھیوں کے ٹوٹ گئے پَر اُڑان سے

جانے کہاں اڑا کے ہوا لے گئی اسے
نکلا تھا ایک عکس دھوئیں کے مکان سے

وہ دن بھی تھے کہ دوڑتے پھرتے تھے اور اب
جمنے لگا رگوں میں لہو بھی تھکان سے

شاید زمین چھوڑنی پڑ جائے ایک دن
کوئی بُلا رہا ہے مجھے آسمان سے

پنچھی کی خیر ہے نہ شکاری کی خیر ہے
اس بار تیر ایسا چلے گا کمان سے

تاریکیوں نے پا ہی لیا صبح کا سراغ
بجھتے ہوئے چراغ کی لو کے نشان سے

مری تزئین کرنے کا بہانہ کیوں بناتا ہے
میں خود بگڑا ہوں تو مجھ کو زمانہ کیوں بناتا ہے

مکانوں کے مکینوں کی سمجھ میں آ نہیں سکتا
پرندہ پیڑ پہ ہی آشیانہ کیوں بناتا ہے

اگر ہمت ہے تو اک بار پھر دُشمن پہ حملہ کر
لڑائی ہار کر خود کو نشانہ کیوں بناتا ہے

گدائی کا کبھی یہ راز شاہوں پر نہیں کھلتا
بھکاری مانگ کر پیسے خزانہ کیوں بناتا ہے

پروں میں آسماں بھر کر اِنہیں اُڑنا سکھا رانجھا
پرندوں کو اسیرِ آب و دانہ کیوں بناتا ہے

جنگل بیلا پھول
تجھ بن کچھ بھی یاد نہ آئے
کتنی اچھی بھول

کیا ہوا جھانک لیا چاند اگر پانی میں
اب سمندر کوئی آتا نہیں جولانی میں

راہ میں خرچ ہوئے ہیں تو خیال آیا ہے
گھر سے نکلے ہی تھے کیوں بے سرو سامانی میں

سوچ کی ٹھہری ہوئی جھیل میں سناٹا ہے
پھینک پتھر کوئی ہلچل سی تو ہو پانی میں

پہلے ہی جسم کا ملبوس سلامت کب تھا
حرج اب کیا ہے جو پھرتے رہیں عریانی میں

اب کے طوفاں ہی کچھ اس طرح سے آیا ہے بشیرؔ
میں کنارے پہ کھڑا ڈوب گیا پانی میں

پھول تھے سرسوں کے
کتنی جلدی ٹوٹ گئے
ناطے برسوں کے

اک سفر اور ابھی تھا مرا صحراؤں میں
تم نے کیوں باندھ دی زنجیر مرے پاؤں میں

تُجھ کو پڑھنے کا سلیقہ ہی نہ آیا ورنہ
نام ہے تیرا مرے ہاتھ کی ریکھاؤں میں

مجھ کو بس اپنی ہی قامت میں شجر ہونے دے
تُو جگہ ڈھونڈ کہیں اپنے لئے چھاؤں میں

اے خدا اُس کے تکبر سے بچانا مجھ کو
وہ یہ کہتا ہے کہ افلاک گریں پاؤں میں

راستے اتنے گئے شہر کی جانب رانجھا
گاؤں کے لوگ بھی اب ملتے نہیں گاؤں میں

برگد کی چھاؤں میں
میں چاہتا ہوں رہنا
ہردم ترے گاؤں میں

کیسے کہیں کب تم سے بڑھ کر دیکھ لیا ہے
ہم نے بھٹک کر شہر میں در در دیکھ لیا ہے

اک دن سب سے اپنے عکس چھپا ہی لے گا
وہ آئینہ جس نے پتھر دیکھ لیا ہے

کچھ نہ کچھ اب اپنے لئے بھی جی کر دیکھیں
تیرے لئے تو ہم نے مر کر دیکھ لیا ہے

دل کرتا ہے آنکھیں موند کے دُنیا دیکھوں
آنکھیں کھول کے ہر اک منظر دیکھ لیا ہے

ڈھلتے ہوئے سُورج کی آنکھ نہیں کھلتی ہے
جلتے دیئے کا جب سے منظر دیکھ لیا ہے

اپنے آپ سے ٹھوکر کھا کر گرنا ہو گا
رستے کا ہر کنکر پتھر دیکھ لیا ہے

نقدِ ہنر کوئی
دھندلاتی ہے چہروں کو
گردِ سفر کوئی

کوئی بھی کہیں اُس کو بڑائی نہیں دیتا
جو شخص ستم سہہ کے دُہائی نہیں دیتا

پرواز کے موسم کا ہے دن آخری لیکن
صیاد پرندوں کو رہائی نہیں دیتا

تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی کو خبر کیا
گرداب کبھی آب کو کائی نہیں دیتا

ہے کتنی عجب جسم کے زنداں کی اسیری
جو قید ہے وہ خود کو رہائی نہیں دیتا

پیڑوں کی ہر ایک شاخ تو پھل پُھول چکی ہے
اب کیوں مِرے ہاتھوں کو رسائی نہیں دیتا

زیست کا کیا امکان؟
پھول تو سارے سوکھ گئے
خالی ہے گلدان

آندھی بھی ہُوا کرتی ہے رنجور زیادہ
پیڑوں پہ اُتر آئے اگر بُور زیادہ

تُو مجھ سے جُدا ہو کے کہاں جائے گا آخر
تنہائی تو کر دیتی ہے محصور زیادہ

اے رات کی تاریکی ڈراتی ہے مجھے کیوں
اس بار مری آنکھ میں ہے نُور زیادہ

ہم لوگ بھی کس رُت کے شجر ہیں کہ ہمیشہ
پھلتا ہی نہیں اپنا کبھی بُور زیادہ

میں شب سے نہیں ڈرتا کہ میں چاند ہوں راںجھا
تاریکی میں کھلتا ہے مرا نُور زیادہ

بیٹھنے سے کیسے طے اپنا سفر ہو جائے گا
چل کے دیکھیں گے تو رستہ مختصر ہو جائے گا
دُشمنوں سے جیت جانے کے لئے کوشش کرو
جنگ ہاری تو لہُو سے جسم تر ہو جائے گا

بھید جو بھی ہو بھید کھولتا ہے
آئنہ سچ ہمیشہ بولتا ہے

ہو کے اکثر سخن نوا کوئی
میرے کانوں میں رس سا گھولتا ہے

زیست کے بوجھ کو اٹھائے ہوئے
آدمی ساتھ ساتھ ڈولتا ہے

بجھ چکی کب کی آتشِ خواہش
راکھ اب کس لئے پھرولتا ہے

جا چکا ہے اُڑان کا موسم
کس لئے اب پروں کو کھولتا ہے

چاند ڈوبا اپنی آب و تاب میں رہتے ہوئے
ہم نے کیوں آنکھیں بچھا دیں خواب میں رہتے ہوئے

یُونہی زمین پہ تنکوں سے مت لکیر نکال
اُٹھا کے تیشہ پہاڑوں سے جُوئے شیر نکال

بھرے ہوئے ہیں پُرانے کھنڈر خزانوں سے
زمین کھود کہیں سے زرِ کثیر نکال

یہ روز روز کا مرنا مجھے قبول نہیں
مرے بدن سے خدا را مرا ضمیر نکال

کہ جنگ میں مرے دُشمن کے ساتھ دوست بھی تھے
جو میری پُشت پہ آ کر لگے وہ تیر نکال

یہ محبسوں کی گھٹن انقلاب لاتی ہے
جو قید ہیں ترے زندان میں اسیر نکال

میں زمیں پر چلنے والا شخص تھا پنچھی نہ تھا
رزق کی خواہش نے اُڑنے کے لئے پر دے دیئے

دیکھ پانی بہت بہاؤ میں ہے
زیست کاغذ کی ایک ناؤ میں ہے

اُس کو گلشن میں ایستادہ کر
جو شجر بھی یہاں جُھکاؤ میں ہے

منزلوں کا نشان کیسے ملے
قافلہ زیست کا پڑاؤ میں ہے

نرم پڑنے لگی ہے سانس کی چال
جسم سارا مگر تناؤ میں ہے

اَب پرندے نہ پھَل نہ پتّے ہیں
پیڑ پھر کس لئے دباؤ میں ہے

پانی بھرے ساگر
صبر کا جب بندھن ٹوٹے
بھر لینا گاگر

ہلنے کی سکت نہیں تھکی ہوئی سپاہ میں
کب کا جا چکا غنیم تو قیام گاہ میں

کس طرح سفر کریں کہ راستوں میں دُور تک
اُڑ رہی ہے گرد اور دُھند ہے نگاہ میں

رُوح کی مٹھاس کا حصار ٹوٹتے ہی لوگ
جسم کے اسیر ہو کے رہ گئے گناہ میں

ہے ہَوا بھی تیز تر کہاں رُکیں نہیں خبر
ہم مثالِ خس چلے ہیں سیلِ بے پناہ میں

ہم سے پہلے جانے والے سب ہَوا مزاج تھے
پاؤں کے نشان بھی کہیں نہیں ہیں راہ میں

جھیل کنول جگنو
اک دوجے میں کھو جائیں
آ اب میں اور تو

حقیقت کو حقیقت کہنے کا بدلہ لیا جائے
جو شیشہ بولتا ہے اب اُسے پتھر کیا جائے

یہاں ہر رُت میں اچھے اور سچے خواب اُگتے ہیں
مری آنکھوں کے زخموں کو نہ کانٹوں سے سیا جائے

سُنا ہے اُس گھڑی بنجر بدن سیراب ہوتے ہیں
فلک سے زہر بھی اُترے تو بارش میں پیا جائے

سکوتِ شام تنہائی کہیں بھی ٹوٹ سکتا ہے
بڑی آہستگی سے نام بھی اپنا لیا جائے

گزر ہی جائے گی یہ عمر آخر عمر ہی تو ہے
کسی بھی شہر میں جیسے بھی ہو رانجھا جیا جائے

ڈھونڈا نگر نگر
رات جہاں سویا تھا
نکلا تیرا در

ہجر کے سائے ہوئے ہیں کب کسی منتر سے دُور
کاٹنی ہے آج کی شب بھی کہیں بستر سے دُور

سوچتا ہے کوئی مجھ میں ماورا سے بھی پرے
دیکھتا ہے کوئی مجھ میں آنکھ کے منظر سے دُور

ایک آنے والے اچھے وقت کی اُمید پر
نوکری کرتا ہوں اپنے شہر اپنے گھر سے دُور

کھنچتی ہے اس کو اِک نادِیدہ دُنیا کی کشش
گھومتی ہے آج کل میری زمیں محور سے دُور

دے رہا ہے ہر کوئی رانجھا فریبِ دوستی
لب پہ نام اِک دوسرے کا اور دِل اندر سے دُور

بہتے پانی میں
صحرا گلشن لگتا ہے
سب کو جوانی میں

ابھی محفوظ ہی کب ہیں شکستہ بام و در اپنے
فصیلِ شہر سے باہر نہ رکھ شیشے کے گھر اپنے

ابھی بنجر زمینوں کی جڑوں میں ہے نمی باقی
مجھے اُمید ہے اِک دِن ہرے ہوں گے شجر اپنے

یہی کافی ہے کچھ ہی عظمتِ دستار رہ جائے
وگرنہ کج کلاہی سے کہاں اونچے تھے سر اپنے

زمانہ رشک کرتا اور قیمت بھی گراں ملتی
پرائے دیس میں جو بیچ دیتے ہم ہُنر اپنے

مثالِ سائباں پتہ بھی رہ جائے تو کافی ہے
رکھے ہیں آندھیوں کی زد پہ اب سارے شجر اپنے

کیا ہے من اندر
جس میں پوجے جاتے ہیں
یادوں کے پتھر

میں گزر آیا ہوں لیکن آہٹوں کے ساز سے
دُور اِک آواز ٹکراتی ہے اِک آواز سے

حادثہ یہ ہے کہ چہرے پر کٹاؤ پڑ گئے
بہہ گیا تھا آنکھ کا دریا غلط انداز سے

زندگی کے موڑ پر اِک فیصلہ ہونا تو ہے
جانے کیا انجام ہو اُس کا مرے آغاز سے

صرف آنکھوں سے پرکھنے کا سلیقہ چاہیے
آ تو سکتی ہے خزاں کی رُت بہار انداز سے

اِس قدر شفاف تھا اُس آئنے کا جسم بھی
دائرے بننے لگے تھے عکس کی آواز سے

کچھ مناسب چال سے چل اے ہوائے تندرو
یہ پرندہ بھی نہ تھک جائے کہیں پرواز سے

دل کا پریم نگر
ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے
کچھ میرے اندر

روشنی چھا جائے شاید کوچہ و بازار پر
چاند رکھ کر آ گیا ہوں رات کی دیوار پر

لوگ اپنی نفرتیں بھی یوں زمیں میں بو گئے
ہر طرف پھل کی طرح پتھر اُگے اشجار پر

گر پڑی تو دوش کیا دیں سازشِ سیلاب کو
بارشوں کے زخم بھی تھے ریت کی دیوار پر

پتھروں کو آج تک ہنستے ہوئے دیکھا نہیں
پُھول آخر کس طرح کِھلتے کسی کہسار پر

اپنے اک دشمن کا سر کاٹا ہے رانجھا اس لئے
اس نے میلے ہاتھ رکھے تھے مری دستار پر

وہ کون تھے جو رونقِ افلاک ہو گئے
ہم تو زمین چھوڑتے ہی خاک ہو گئے

کہیں بھی جا نہ سکے حسرتوں کی لاش لئے
نہ مل سکا جو خُدا تو صنم تراش لئے

بسے ہوئے ہیں کسی شہرِ چیرہ دست میں ہم
نکل سکیں گے نہ ہم خود کو بے خراش لئے

مرے بدن پہ نہیں کوئی رنگِ اصل مرا
میں جی رہا ہوں عجب طرزِ بودوباش لئے

سمندروں میں گری اور گر کے ڈوب گئی
ہوا چلی تھی جو بادل کو قاش قاش لئے

اسیرِ گردشِ دوراں بشیرؔ ہم ہی نہیں
بہت سے لوگ مرے ہیں غمِ معاش لئے

اُجلی لکیریں ہیں
تُو نے دیئے جو غم
میری جاگیریں ہیں

اگرچہ تجھ سے بچھڑنے کا بھی ملال نہیں
تو دل سے کس لئے جاتا ترا خیال نہیں

جو حسن تجھ کو ملا ہے تو اس پہ مان نہ کر
یہ سب کرم ہے خدا کا ترا کمال نہیں

جو ہو سکے تو مجھے بھول جانا تُو اے دوست
سِوا اب اس کے کوئی بھی مرا سوال نہیں

جو حرف لکھا ہے ہم نے ہمیشہ سچ لکھا
وہ روشنی ہے یہ جس کو کبھی زوال نہیں

تمہارا حسن بھی بے مثل ہے زمانے میں
مرے بھی عشق کی ملتی کوئی مثال نہیں

نجانے کس لئے یہ زندگی مچلتی ہے
نہ دن نکلتا ہے اپنا نہ رات ڈھلتی ہے
بس ایک بار کوئی آنکھ میں سما جائے
کسی کی شکل کہاں دل سے پھر نکلتی ہے

جسموں سے بھی نفرت کا کوئی زہر نکالے
کھنڈرات سے تو ہم نے کئی شہر نکالے

ہلتا ہی نہیں صدیوں سے ٹھہرا ہوا پانی
برفاب سے کس طرح کوئی لہر نکالے

اس بار مجھے باغ کے کانٹوں نے ڈسا ہے
اب آ کے کوئی پھُول مرا زہر نکالے

رانجھا یہ کھجوروں کے درختوں کی ہے خواہش
صحرا سے بھی پانی کی کوئی نہر نکالے

رات کا منظر چراغوں سے بدلتا کیوں نہیں
اے مِرے سُورج اُجالے کو نکلتا کیوں نہیں
سبز تھا لیکن یہ کہہ کر پیڑ کو کاٹا گیا
ٹہنیوں پر پُھول آتے ہیں تو پَھلتا کیوں نہیں

اِتنا اُڑتا کہ یہ اَفلاک دُہائی دِیتا
میرا صیّاد اگر مجھ کو رِہائی دِیتا

جرم ایسا تھا کہ ہر شخص ملوث ٹھہرا
اپنے کردار کی پھر کون صفائی دیتا

آئنوں میں بھی وہ آئینہ نہیں تھا جس میں
کوئی جیسا بھی تھا ویسا ہی دِکھائی دیتا

میں تو دریا تھا جو رُک جاتا تو جوہڑ کی طرح
ایک دن میرے بدن پر بھی وہ کائی دیتا

اُس کے آ جانے کا احساس تھا خُوشبو جیسا
وہ کوئی جسم نہیں تھا کہ دِکھائی دیتا

پیاس ہی کچھ ایسی ہے یوں ہے دھیان پانی کا
ریت پر بھی ہوتا ہے اب گمان پانی کا
ہم پناہ لینے کو اب بھلا کہاں جائیں
ہے زمین کاغذ کی آسمان پانی کا

وہ نجانے کیوں ہم سے بدگمان ہوتے ہیں
پیڑ تو مسافر کا سائبان ہوتے ہیں

ہم بُلند ہو کر بھی یہ کبھی نہیں کہتے
آدمی کے پاؤں میں آسمان ہوتے ہیں

کوئی استقامت دے اور قدوقامت دے
سختیوں سے ہی پتھر کب چٹان ہوتے ہیں

ہم سدا مسافت میں زندگی گزاریں گے
بے دیار لوگوں کے کب مکان ہوتے ہیں

اتنا چیختے کیوں ہو کیا تمہیں نہیں معلوم
اونچا بولنے والے بے زبان ہوتے ہیں

رشتہ گہرا ہے
تیرے جانے کا منظر
آنکھ میں ٹھہرا ہے

ہمیں یہ فخر رہا ہے اُڑان میں رہ کر
زمیں سے پیار کیا آسمان میں رہ کر

یہ کون جنگ میں آیا ہے سامنے میرے
کہ تیر سوکھ رہا ہے کمان میں رہ کر

عجیب بے سروسامان تھے کہ ساری حیات
گزار دی ہے کسی کے مکان میں رہ کر

وہ ایک عکس کہ صدیاں گزر گئیں لیکن
پنپ رہا ہے ابھی تک گمان میں رہ کر

اُسے بھی توڑ دیا ہم نے تیشۂ گل سے
جو سنگ سخت ہوا تھا چٹان میں رہ کر

شام جب آئی فنا کی آخری حالت میں تھا
ڈوب جانے کے لئے سُورج بڑی عجلت میں تھا

بے سبب ناز اٹھانے کی ضرورت کیا ہے
ترکِ الفت میں بہانے کی ضرورت کیا ہے

وہ تجھے بھول گیا ہے تو یہ اس کی مرضی
آس کے دیپ بجھانے کی ضرورت کیا ہے

پھیل جا اس کے بدن میں بھی لہو کی مانند
صرف آنکھوں میں سمانے کی ضرورت کیا ہے

کوئی ہمراز اگر ملتا نہیں دنیا میں
درد پھر اپنے بتانے کی ضرورت کیا ہے

زورِ بازو سے جو تعبیر کو پا سکتے ہو
خواب پلکوں پہ سجانے کی ضرورت کیا ہے

بھروسہ کب ہے مجھے اپنی زندگانی پر
کوئی بھی عکس ٹھہرتا کہاں ہے پانی پر

سوچا بھی نہیں دل میں بھی ڈر تک نہیں رکھا
ہم نے کبھی غم دیدۂ تر تک نہیں رکھا

ہم لوگ وہ قیدی ہیں گھروں میں بھی جنہوں نے
دِیوار کی تعمیر میں در تک نہیں رکھا

منزل کے لئے گھر سے نکل آئے ہیں لیکن
رستے کے لئے زادِ سفر تک نہیں رکھا

چھاؤں کی تمنا تھی مگر دُھوپ میں ہم نے
محدود کبھی خود کو شجر تک نہیں رکھا

کچھ اتنی تھکاوٹ ہے کہ مُدّت ہوئی راجھا
پاؤں بھی کبھی راہگزر تک نہیں رکھا

حق کی خاطر جب بھی کسی کو مارا جائے گا
سب سے پہلے میرا نام پکارا جائے گا

لوگوں کی طرح ہاتھ میں زر ہی نہیں آیا
ہم کیسے کہیں کوئی ہُنر ہی نہیں آیا

کچھ اتنا چلا ہوں کہ کھڑا سوچ رہا ہوں
یہ کیسی مسافت ہے کہ گھر ہی نہیں آیا

کس رُت میں ہوا قید کہ اُڑنے کیلئے بھی
پنچھی کے بدن پر کوئی پَر ہی نہیں آیا

خواہش تھی کہ چھاؤں میں ہی منزل پہ پہنچتے
رستے میں مگر کوئی شجر ہی نہیں آیا

کیا پوچھتے ہو ہم سے فسوں خانۂ حیرت
جو سامنے تھا وہ بھی نظر ہی نہیں آیا

کس جنگ میں ہارا ہوں کہ مدت ہوئی راجھا
میدان سے واپس مرا سر ہی نہیں آیا

مولا رکھے خیال
دو ہی پھول ہیں میرے
رملہ اور بلال

چلا گیا ہے کوئی اس طرح جلا کے مجھے
ہوا بھی دیر تلک روئے گی بجھا کے مجھے

عجیب بارِ گنہ رکھ لیا تھا کاندھے پر
سکوں ملا نہ ندامت سے سر جھکا کے مجھے

ہر ایک عکس مجھے دیکھتا ہے سنگ بدست
سجا دیا ہے کہاں آئنہ بنا کے مجھے

لہولہان ہوا ہوں جو لڑ کے حق کیلئے
شہید یاد بہت آئے کربلا کے مجھے

میں اپنے پاؤں پہ پہنچا ہوں چل کے منزل تک
دیا گیا ہے کہاں راستہ بنا کے مجھے

یادوں کا حوالہ ہے
اب تیری محبت میں
ہر سمت اجالا ہے

کبھی زمین کبھی آسمان میں رکھا
مجھے بتا تو مجھے کس گمان میں رکھا

میں کوئی قیمتی سامان تو نہیں تھا مگر
چھپا کے اس نے مجھے بھی مکان میں رکھا

ہماری اُس سے فقط حرف کی لڑائی تھی
کسی نے تیر بھلا کب کمان میں رکھا

اُترنا سیکھ لیا ہے زمیں پہ سورج نے
بتا تو سایہ کوئی سائبان میں رکھا

زمیں نے ہاتھ اُٹھائے ہیں آسماں کی طرف
رہے گا چاند بھی کب آسمان میں رکھا

آندھی سے کبھی ٹوٹا کبھی خود ہی گرا ہے
پیڑوں پہ جو پتہ بھی سرِ شاخ رہا ہے